© rasailojaraid.com

مذہب اور تجدید مذہب

عبدالحمید صدیقی

۱ ۔ مذہب کے عناصر ترکیبی

"تاثرات اور وجدانات کی تعریف عموماً بہت دشوار ہوتی ہے۔ یہ چیزیں چونکہ سراسر کیفی اور ذوقی ہیں اس لیے ایک انسان ان کے اثرات کو قلب و دماغ کی اتھاہ گہرائیوں میں پوری طرح محسوس کرتا ہے، اُن کے مظاہر کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، مگر انہیں پوری صحت کے ساتھ الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ انسان کے ان نازک اور لطیف احساسات میں سب سے زیادہ مؤثر، سب سے زیادہ ہمہ گیر اور سب سے زیادہ انقلاب انگیز احساس حاسۂ مذہبیت ہے۔

مذہبی تاثرات کے لیے جو "احساس" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ مذہب اور شعور آپس میں ایک دوسرے سے بالکل بے تعلق ہیں، یا انہیں ایک دوسرے کے ساتھ عداوت اور دشمنی ہے اور مذہب کا خمیر سراسر ایسے جذباتی اور غیر شعوری عناصر سے اٹھایا گیا ہے جن میں شعور، ذوق اور آگہی کا کوئی حصہ نہیں۔ یہ سارے مفروضات بالکل غلط ہیں۔ مذہب کا انسانی عقل سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ لیکن اس بدیہی حقیقت کے اعتراف کے باوجود اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مذہب کا منبع و مخزن دلِ بیتاب ہی ہے جہاں سے اس کی ابتدا ہوتی ہے۔ جذبہ و احساس کی قوت ہی سے یہ آگے بڑھتا اور ترقی کرتا ہے۔ شعور کے عرفان سے انسان کے ذہن میں اس کی صحیح معرفت پیدا ہوتی ہے۔

مَیں اس وقت اس بحث کو نظر انداز کرتا ہوں کہ "دلِ بیتاب" شعور ہی کا حصہ ہے یا یہ انسان کی کوئی الگ کیفیت ہے۔ اس مسئلہ پر حکمائے قدیم و جدید نے بڑی سیر حاصل بحث کی ہے اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہر ایک نے اپنے موقف کی تائید میں بڑے وزنی دلائل پیش کیے ہیں۔ اگر ان کے درمیان نوعی اختلافات کا انکار بھی کر دیا جائے تو پھر بھی یہ حقیقت اپنی جگہ قائم رہتی ہے کہ مذہب کو دل کی بے قراری نے جنم دیا ہے۔ انسان خواہ کسی دور کا ہو، اس کا تعلق خواہ کسی خطۂ ارضی سے ہو، اس کے دل میں یہ خواہش ہمیشہ موجزن رہی ہے کہ وہ کائنات کے وسیع و پیچیدہ نظم کو سمجھنے کی کوشش کرے اور اس نظامِ تکوینی کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ اس کے پرے اُس حقیقتِ کبریٰ کا کھوج لگائے جس کے بغیر خود اُس کا وجود ہستی کی وسعتوں میں بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ مجھے یہاں اس بات سے کوئی بحث نہیں کہ وہ حقیقتِ کبریٰ کا صحیح ادراک کر سکتا ہے یا نہیں، یا وہ حقیقتِ کبریٰ کس چیز کو ٹھیراتا ہے۔ مجھے جو کچھ کہنا ہے وہ صرف یہ کہ دنیا کے ہر انسان میں "غیر محدود" اور "لامتناہی" کو سمجھنے کی گہری لگن ضرور موجود رہتی ہے جس میں وہ تمام اوصافِ عالیہ بدرجۂ اَتم موجود ہوں جنہیں وہ خود اپنی ذات میں پیدا کرنے کا متمنی ہوتا ہے اور جس کی بدولت ہی اُسے یقین و ایمان کے لازوال محرکاتِ عمل ہاتھ آتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ایک شخص "غیر محدود اور لامتناہی" کسی ایک چیز کو خیال کرے اور دوسرا کسی دوسری چیز کو۔ ایک کے نزدیک کواکب لامتناہی ہوں اور دوسرے کی نظر میں مادہ غیر محدود ہو۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لامتناہی کو سمجھنے کی تڑپ ہر دل میں، بشرطیکہ وہ احساسات سے یکسر بیگانہ نہ ہو چکا ہو، ضرور موجود ہوتی ہے۔ آج تک کسی انسان کو اس سے مفر نہیں ہوا۔ لامحدود کو سمجھنے کی یہ تڑپ نوعِ بشری کا مشترک اور ایسا بیش قیمت سرمایہ ہے جس سے اُس کی انسانیت وابستہ ہے اور یہی تڑپ مذہب کی اساس اور اس کا جوہرِ حیات ہے۔ یہ مذہبی احساس ہر شخص کے ارتقائے نفسی میں ایک ہلکی سی لے کی طرح ساتھ رہتا ہے۔ البتہ اس کے مظاہر مختلف انسانوں میں مختلف ہوتے ہیں۔ کسی شخص کے ہاں یہ احساس زلزلہ اور طوفان اٹھاتا ہے، نئی زندگی اور قلندرانہ وجد و حال پیدا کرتا ہے، اور کسی کے دل میں یہ احساس اس طرح رہتا ہے کہ اسے اس کی گہرائی اور شدت کا شعور تک نہیں ہوتا۔ لیکن ہر صورت میں ساری زندگی کا آغاز و انجام یہی ہے۔ آپ اس احساس کو کسی نام سے موسوم کریں، لیکن کسی شخص کا اس حاسہ سے خالی ہونا ویسا ہی ناممکن ہے جیسا کہ احساسِ زندگی سے عاری ہونا۔ اس نقطۂ نظر سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اگر دیکھا جائے تو انسان جس کے دل میں لامتناہی کو جاننے کی تڑپ پیدا ہوتی ہے، شعورِ انسانی جو اس خلش کو دُور کرنے کے لیے اُسے رہنمائی دیتا ہے اور خود اُس کی انسانیت جس کی بنا پر اُسے یہ شرف ملا ہے کہ وہ لامتناہی کی تلاش میں سرگرداں ہو، تینوں آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ اسی حقیقت کو اگر یُوں کہا جائے کہ انسانیت اور مذہب یعنی لامتناہی کو سمجھنے کی آرزو اصل میں ایک ہی ہیں تو اس میں قطعاً مبالغہ نہ ہوگا۔

مذہب کا مسئلہ کچھ زیادہ پیچیدہ صورت اختیار نہ کرتا اگر معاملہ صرف لامتناہی کو جاننے کی خواہش تک محدود رہتا۔ لیکن یہاں اصل مشکل یہ پیش آتی ہے کہ لامحدُود کا مبہم سا ادراک یا اُس سے محض رسمی سی شناسائی انسان کے لیے اطمینان کا باعث نہیں بنتی۔ وہ چونکہ اپنے آپ کو اُس کے ارادے اور منشا کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی بھی شدید آرزو رکھتا ہے اس لیے اس کے دل میں بالکل فطری طور پر یہ خواہش بھی اُبھرتی ہے کہ وہ اُس کے منشا کو صحیح طور پر معلوم کرے۔ کیونکہ جب تک وہ اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوتا اس کی زندگی کوئی صحیح رُخ اختیار نہ کرنے کی وجہ سے کائنات کی وسعتوں میں یکسر بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ہم اُس حقیقتِ کُبریٰ کے منشا اور ارادے کو خود اپنی ذہنی کاوش سے دریافت کر سکتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات فطری طور پر ناممکن ہے۔ ایک انسان جس کی فکری صلاحیتیں بالکل محدود ہیں وہ آخر غیر محدود کے مصالح، اُس کے ارادے اور منشا کو کس طرح سمجھ سکتا ہے۔ انسان جب بھی اس معاملے میں کوئی کوشش کرے گا تو اس کی یہ کوشش بالکل بے جا جسارت ہوگی۔ اُس کے فکری حدود و قیود قدم قدم پر اُس کی راہ میں حائل ہونگے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو شعور کی جو صلاحیتیں عطا کی ہیں وہ بے کار ہیں عقلِ انسانی بلاشبہ ایک نہایت ہی مفید چیز ہے۔ یہ ایک اچھی ترازو ہے لیکن ابن خلدون کے الفاظ میں جو ترازو سونے کا وزن کرنے کے لیے تیار کی گئی ہو اُس پر پہاڑوں کو آخر کس طرح وزن کیا جا سکتا ہے۔ محدود ذہن، مظاہرِ قدرت سے قادرِ مطلق کی معرفت حاصل کرنے کے لیے نشانِ راہ کا کام تو دے سکتے ہیں لیکن یہ خارجی شواہد کبھی اصل حقیقت کی جگہ نہیں لے سکتے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انسان کی نہ صرف نظر محدود ہے بلکہ زمان و مکان کی حد بندیوں کی وجہ سے، ایک خاص ماحول اور ایک خاص دَور سے تعلق رکھنے کی بنا پر وہ اپنے اندر بالکل فطری طور پر بعض ایسے تعصبات پال لیتا ہے جو اس کی نگاہوں کو مادی سُود و زیاں کے چکّر سے نکلنے نہیں دیتے۔ اُس کی نگاہ اپنے دَور اور ماحول کے خم و پیچ ہی میں اُلجھ کر رہ جاتی ہے یا اپنے ذاتی، خاندانی، نسلی اور قومی مفادات کے گرد گھومتی رہتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس قسم کے محدود طرزِ فکر اور مفاد پرستانہ طرزِ عمل کے ساتھ انسان کے فکر و نظر میں وہ آفاقیت اور اُس کے طرزِ عمل میں وہ بے لوثی پیدا نہیں ہو سکتی جو اُسے حقیقتِ کبریٰ سے ہم آہنگ کرنے کے قابل بن سکے۔ جو حقیقت آفاقی ہو، جو زمان و مکان کی حدود و قیود سے آزاد ہو، جو ازلی و ابدی ہو، اُس کے ساتھ وہ انسان آخر کس طرح مطابقت پیدا کر سکتا ہے جس کی نگاہ میں امروز و فردا کے حجابات حائل ہوں، جو انسانوں کے درمیان رنگ و نسل، زبان اور وطن جیسے اتفاقی بلکہ بے مقصد امتیازات کی وجہ سے تفریق کرے، جس کے اعمال کے محرک وقتی اور مادی فوائد ہوں اور جو کسی شے کی قدر و قیمت صرف اُس کی ظاہری افادیت دیکھ کر متعین کرے اور اُن بے شمار مصالح کو دیکھنے سے قاصر رہے جو سطح کے نیچے کارفرما ہیں۔ ایسا شخص خواہ زبان سے اس امر کا اقرار کرے یا نہ کرے لیکن اُس کا اندازِ فکر اس حقیقت کا پُوری طرح آئینہ دار ہے کہ وہ مادہ کی اس محدود دنیا کو ہی کائنات کی اصل ابتدا اور انتہا سمجھتا ہے اور اس سے ماورا کسی دوسرے نظام کا قائل نہیں۔ ظاہر بات ہے کہ غور و فکر کا یہ مادہ پرستانہ انداز در حقیقت اُس بنیادی احساس کی سراسر نفی ہے جو لا متناہی کو سمجھنے کے لیے اُس کے قلب و دماغ میں بیدار ہوتا ہے۔ جب ایک شخص کی نظر صرف مادّی زندگی کے ظلمات ہی میں اُلجھ کر رہ جائے اور وہ اس بنا پر غیر مادّی اور روحانی عناصر کو حیاتِ انسانی میں کوئی فیصلہ کن مقام دینے پر تیار نہ ہو تو اُس کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل میں وہ آفاقیت، روحانیت، اور بے لوثی کس طرح پیدا ہو سکتی ہے جو اُسے لا محدود سے ہم آہنگ کرکے اُس کے قلب و دماغ کو سکون کی نعمت سے مالا مال کر سکے۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ عقل تو بلا شبہ قادرِ مطلق کا منشا معلوم نہیں کر سکتی البتہ وجدان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس قوت کو تجویز ہی سر انجام دے سکتی ہے۔ لیکن اس قسم کے دعوے کرنے والے شاید اس بدیہی حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ وجدان کی راہ میں بھی وہی مشکلات حائل ہیں جو عقل کے راستے کا سنگِ گراں ہیں۔ وجدان بلاشک عقل سے زیادہ لطیف ہے لیکن اس حقیقت سے آخر کس طرح صرفِ نظر کیا جا سکتا ہے کہ انسان کے وجدان پر اس کی مادی زندگی کی پرچھائیاں برابر پڑتی رہتی ہیں جو حقیقتِ کبریٰ کے صحیح ادراک میں بیسیوں رکاوٹوں کا باعث ہوتی ہیں۔ جس طرح انسان قدرت کے رنگا رنگ مظاہر کو دیکھ کر خالقِ کائنات کے وجود کا اندازہ کر سکتا ہے بالکل اسی طرح انسان کی روحانی اور قلبی کیفیات سے اس بات کا احساس ضرور پیدا ہوتا ہے کہ ان کا کوئی معروض ضرور ہونا چاہیے جس کے یہ پرتو ہیں۔ وجدان کی مدد سے اس معروض کا ہلکا سا ادراک بھی ممکن ہے۔ مگر یہ حاسہ اس معروض کی حقیقی نوعیت، اس کے مزاج اور اس کے ارادے کو پوری طرح سمجھ نہیں سکتا۔

عقل و وجدان کی یہ نارسائی اس بات کی متقاضی ہے کہ جو کام یہ دونوں اپنی محدود صلاحیتوں کی بنا پر کرنے سے قاصر ہیں، اسے قادرِ مطلق اپنے خاص انتظام کے تحت خود سر انجام دے۔ یہ انسان کی بنیادی اور اساسی ضرورت ہے اور ہوا اور پانی سے کہیں زیادہ ناگزیر۔

اس کی تین صورتیں ہی ممکن ہیں:۔

(الف) لامحدود اپنا منشا ہر انسان پر براہِ راست القا کر دے۔ اس شکل کے اختیار کرنے سے انسان اور حیوان میں کوئی فرق باقی نہ رہے گا۔ جس طرح شہد کی مکھیاں اپنے ارادے اور منشا کے بغیر پھولوں پر یلغار کرتی اور رس چوستی ہیں بالکل اسی طرح انسان بھی میکانکی طریق سے فطرت کے خاموش اشارے پر گامزن رہتا۔ اس طرح نہ تو اس کے دل میں حقیقتِ کبریٰ کا کھوج لگانے کے لیے کوئی خواہش اور آرزو ہوتی اور نہ عقل و وجدان کی کوئی افادیت باقی رہتی۔ ان دونوں کی ضرورت ہی اس لیے پیش آتی ہے کہ یہ انسان کو مجاز سے حقیقت کی طرف لے جانے میں اس کی معاونت اور دستگیری کرتے ہیں۔ اگر حقیقت خود بخود پوری طرح بے حجاب ہو کر انسان کے سامنے آ جائے تو پھر عقل و شعور کا کوئی مصرف باقی نہیں رہتا کیونکہ ایسے میں انسانیت کے سارے امتیازات خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ جب انسان کے دل میں لامتناہی کو سمجھنے کی آرزو [illegible] گی تو پھر یہ عقل، شعور اور وجدان [illegible] بیکار ہو کر رہ جائیں گے۔ مگر یہ معاملہ پھر یہیں تک ختم نہیں ہوتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بلکہ اس سے خیر و شر اور حق و باطل کا امتیاز بھی یکسر ختم ہو جاتا ہے۔ جب تک قادر مطلق کا پسندیدہ ضابطۂ اخلاق انسان کے اندر اسی طرح پیوست ہو جائے جس طرح کہ ہمارے اندر جبلتیں سموئی ہوئی ہیں، اور وہ ان کے اشارے پر عمل کرنے پر مجبور ہو تو اس کے کسی فعل پر نیک و بد اور محمود و مذموم کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ نیک و بد کے درمیان امتیاز، اور نیکی کا راستہ اختیار کرنے کی وجہ سے انسان کی عزت و تکریم کا سارا دار و مدار صرف اس بات پر ہے کہ وہ بھلائی اور برائی دونوں راستوں میں سے کوئی ایک راستہ اختیار کرنے پر قدرت رکھنے کے باوجود برائی کے راستے کو ترک کر کے نیکی کی راہ اختیار کرے۔ یہی انسانیت کا حقیقی جوہر ہے اور اسی وجہ سے انسان کے اندر اخلاقی حدود کے تقاضا کو صحیح طور پر سمجھنے کی آرزو پیدا ہوتی ہے۔

ان گزارشات سے یہ حقیقت ذہن نشین ہو چکی ہو گی کہ انسان کے اندر رشد و ہدایت کی جو خوبی، نیکی اور بدی کے درمیان تمیز، اور پھر کسی ایک روش کو چھوڑ کر دوسری روش اختیار کرنے کی آزادی۔ یہ سب ناقابلِ تردید شواہد اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ صاحب ارادہ اور ذی شعور انسان کے اندر قادر مطلق نے جبلتوں کی طرح ضابطۂ اخلاق پیوست نہیں کیا۔ اگر وہ یہ طریق اختیار کرتا تو پھر عقل و شعور وجدان اور انسان کی آزادی جو اس کی انسانیت کے حقیقی جوہر ہیں یکسر بیکار اور بے مصرف ہو جاتے۔

ان حقائق کے علاوہ ایک اور احساس بھی الہامی ضابطۂ اخلاق کے براہ راست عطا کی تردید کرتا ہے۔ آپ نے اکثر دیکھا ہو گا کہ انسان کے اندر بسا اوقات بڑی شدت کے ساتھ یہ احساس ابھرتا ہے کہ کوئی چشم بینا اس کی حرکات و سکنات کو دیکھ رہی ہے اور اس کے دل کی انجان گہرائیوں میں ابھرنے والے معصیت آلود خیالات اس احساس کے ساتھ ہی دب جاتے ہیں۔ اس وقت بھی جب کہ دنیاوی گرفت و مواخذہ کا کوئی اندیشہ نہ ہو، سارق متاعِ غیر پر ہاتھ ڈالتے ہوئے یہ محسوس کرتا ہے کہ کوئی زبردست ہاتھ اس کے ہاتھ کو پکڑ کر اسے اس جرم کے ارتکاب سے باز رکھ رہا ہے۔ یہ سراسر روحانی احساس اس بات کی زبردست دلیل ہے کہ انسان کے اندر ایک ایسی لطیف حس موجود ہے جو اسے اس بات کی طرف برابر متوجہ کرتی رہتی ہے کہ ظاہری نیکی یا اجالے کا اخلاق (DAY LIGHT MORALITY) انسان کے فطری تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا بلکہ انہیں پورا کرنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے لیے ذاتِ مطلق پر غیر متزلزل ایمان کی ضرورت ہے، کیونکہ وہی اخلاق کا حقیقی سرچشمہ ہے۔ ہمارا یہ وجدانی احساس ہمیں کسی روحانی ضابطۂ اخلاق کی ضرورت کا احساس تو دلاتا ہے لیکن تنہا یہ انسان کی مکمل رہنمائی کا سامان فراہم نہیں کر سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ہر قدم اور ہر مرحلے پر ایک ہی طرح کی شدت کے ساتھ موجود نہیں رہتا۔ جب ہمارے خیالات میں پاکیزگی ہو تو یہ پوری قوت کے ساتھ اُبھرتا ہے۔ لیکن جب وقتی اور مادی مصالح ہم پر غالب آچکے ہوں تو یہ بسا اوقات دب کر رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صاحب تقدس و تقویٰ انسانوں کو اس احساس کی پرورش کرنے، اسے ہر وقت زندہ رکھنے اور بدی کے مقابلے میں ایک ناقابلِ تسخیر قوت بنانے کے لیے کافی محنت اور ریاضت کرنی پڑتی ہے۔

اگر یہ بات نہ ہوتی اور یہ ہمارے اندر ایک جیسی توانائی کے ساتھ فطری طور پر ہمیشہ موجود رہتا اور زندگی کے ہر گام پر پوری قوت، اور اعتماد کے ساتھ ہماری رہنمائی کرتا تو ہمیں کسی ریاضت کی ضرورت نہ تھی۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بسا اوقات بڑے بڑے نیک اور پارسا افراد کے دلوں میں بھی بعض اوقات یہ احساس بالکل دب کر رہ جاتا ہے۔ بلاشبہ یہ فطرت کا عطیہ ہے لیکن اس کی حفاظت کے لیے ہمیں ایک ایسے ضابطۂ اخلاق کی بھی ضرورت ہے جو اسے نہ صرف برباد ہونے سے بچائے بلکہ اس کے لیے قوت و توانائی کا سامان مہیا کرے۔ وہ روحانی ضابطۂ اخلاق ہمیں قادرِ مطلق سے براہِ راست حاصل نہیں ہؤا۔ اگر وہ مکمل طور پر ہماری فطرت میں داخل ہوتا تو ہم اُس کی کبھی احتیاج محسوس نہ کرتے۔ مگر ہمارے اخلاقی احساس کی ناہمواری اور اسے بیدار رکھنے کے لیے کوشش اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ لامحدود نے اپنے پسندیدہ ضابطۂ اخلاق کو ہم پر مکمل طور پر القا نہیں کیا۔

(ب) لامحدود کا منشا معلوم کرنے کی دوسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ وہ ذاتِ مطلق تحریری شکل میں، یا غیبی آواز کے ذریعے اپنے منشا کو بنی نوعِ انسان تک براہِ راست پہنچا دیتی۔ لیکن اس سے بھی انسان کی فطری آرزو کی تکمیل ممکن نہ تھی۔ انسان محض خدا کے منشا کو جاننے کا خواہشمند نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے افکار و اعمال کو اُس کے تابع کرنے کے لیے بھی بےتاب رہتا ہے۔ اس کے اندر ہمیشہ یہ احساس موجود رہتا ہے کہ وہ جب تک اپنے طرزِ عمل کی لامحدود کے ارادے اور منشا کے ساتھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مطابقت پیدا نہیں کرتا اس وقت تک اُس کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا ۔ اس معاملے میں وہ عملی رہنمائی کا سراسر محتاج ہے ۔ اُسے اس بات کی ضرورت ہے کہ جہاں اُسے ذاتِ مطلق کے ارادے سے پُوری طرح آگاہ کیا جائے وہاں اس ارادے کو عمل کے سانچوں میں ڈھال کر اُس کے سامنے بطور نمونہ پیش کیا جائے تاکہ وہ اپنی عملی زندگی میں اسے اچھی طرح اپنا سکے ۔ اس مقصد کے حصول کے لیے بعض لوگوں کے نزدیک یہ صورت مناسب تھی کہ خود لامحدود انسان کا روپ دھار کر بعض انسانوں کے اندر جلوہ گر ہوتا ——— اور انسانیت کی فکری اور عملی رہنمائی کرتا ۔ اوّل تو یہ اجتماعِ ضدین کسی طرح ممکن ہی نہیں ۔ لامحدود آخر محدود میں کس طرح سما سکتا ہے ۔ اگر بالفرض اسے کچھ فاتر العقل لوگ تسلیم بھی کر لیں تو پھر بھی اصل مسئلہ اپنی جگہ جوں کا توں قائم رہتا ہے ۔

جب لامحدود محدُود کی صورت میں رونما ہوتا تو لامحدُود کو جاننے اور سمجھنے کی تڑپ تو بدستور اپنی جگہ پر قائم رہتی ۔ جو دل لامحدود سے ہم آہنگ ہونے کے لیے مضطرب ہو وہ محدود کو دیکھ کر کس طرح سکون اور اطمینان حاصل کر سکتا ہے ۔ علاوہ بریں انسان کی عملی رہنمائی کے لیے یہ چیز بھی انتہائی ضروری ہے کہ اسی کی نوع سے تعلق رکھنے والا گوشت پوست کا انسان اس کے لیے نمونہ بن کر سامنے آئے ۔ وہ ذات جو ہر عیب اور خطا سے پاک اور منزّہ ہے ، جس کی صلاحیتیں لامحدُود ہیں ، جس کی قوت کا کوئی اندازہ ہی نہیں ، جس کا علم پُوری کائنات کا احاطہ کیے ہوئے ہے ، جسے کبھی کسی قسم کی کوئی ضرورت لاحق نہیں ہوتی ، وہ محدود عقل و فکر اور محدود صلاحیتیں رکھنے والے انسان کے لیے جو اپنی بیشمار احتیاجات رکھتا ہے ، کس طرح نمونہ بن سکتی ہے ۔

(ج) ، لامحدود اور لامتناہی کے منشا اور ارادہ کو انسانوں تک پہنچانے کی باقی ایک ہی معقول صورت رہ جاتی ہے کہ وہ اعلیٰ و ارفع ذات نوعِ بشری میں سے کچھ انسانوں کا انتخاب فرمائے اور پھر اُن مقدس نفوس کے ذریعے نہ صرف اپنے ارادہ اور منشا کو انسانیت پر واضح کرے بلکہ ان کی زندگیوں کو اس کے مطابق پوری طرح ڈھال کر ، اپنے ارادے کے عملی مضمرات بھی انسانوں پر اچھی طرح روشن کر دے ۔ یہ مقدس ہستیاں ہر مذہب میں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں ۔ بلکہ اگر یہ کہا جاتے کہ مذہب کے لیے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کا وجود اتنا ہی ناگزیر ہے جتنا کہ خود لامحدود کا تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ کیونکہ لامتناہی کے منشا کو انسانیت پر آشکارا کرنے کے لیے ان کا بابرکت وجود ہی سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ذریعہ ہے۔ اور اگر یہ حضرات اس مقدس فرض کو سرانجام نہ دیں تو انسان کے لیے لامحدود کی حیثیت محض ایک موہوم احساس کی سی بن کر رہ جائے جو ممکن ہے اُس کے دل میں کبھی کبھی اضطراب تو پیدا کردے لیکن اس اضطراب کو سکون اور اطمینان میں بدلنے میں کبھی کامیاب نہ ہو اور لامحدود کی معرفت کے حصول میں ہمیشہ ٹامک ٹوئیاں مارتا رہے۔

مذہب کے مشترک سرمایہ میں ایک چیز عقیدۂ آخرت بھی ہے، یعنی اس بات کا پختہ یقین کہ یہ چند روزہ حیات مستعار ہی انسان کی پوری زندگی نہیں بلکہ ایک نہایت ہی وسیع زندگی کا آغاز ہے، اور انسان کو قادرِ مطلق نے اس زندگی میں غیر مسئول بنا کر نہیں بھیجا ہے بلکہ وہ اپنے ہر چھوٹے بڑے عمل کے لیے ذاتِ باری کے سامنے جوابدہ ہے، اور آخرت میں اسے اپنے سارے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ جب ہم اس حقیقت کو دل و جان سے تسلیم کر لیتے ہیں کہ اس عالمِ مجاز و محسوسات سے بالاتر، ایک اَن دیکھا روحانی نظام بھی موجود ہے، جس کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کی وجہ سے ہمیں سکون و اطمینان کی دولت ہاتھ آتی ہے تو ہم خود بخود اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر بھی مجبور ہو جاتے ہیں کہ مادہ کی یہ محدود دنیا اخلاقی ضابطۂ حیات کے پورے نتائج برآمد کرنے کے لیے یکسر ناکافی ہے۔ اگر ہمارے اخلاق کے محرک محض مادی مصالح ہوتے تو پھر ہمیں کسی آخرت کے عقیدہ پر ایمان لانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں کہ لامحدود نے ہمیں جو ضابطۂ اخلاق عطا فرمایا ہے اس میں مادی مصالح کے ساتھ ساتھ انسان کے روحانی اور اخلاقی مصالح کا بھی پورا خیال رکھا گیا ہے، تو لامحالہ ہمیں یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ ان روحانی اعمال کے صحیح طور پر برگ و بار لانے کے لیے اس دنیا سے کہیں زیادہ وسیع تر دنیا اور اس مختصر سی زندگی کے مقابلے میں غیر معمولی طویل زندگی درکار ہے، اور ان اعمال کو وزن کرنے کے لیے کچھ دوسرے پیمانۂ اوزان کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے جن پاکباز بندوں نے انسان کو اخلاق اور روحانیت کا سبق دیا ہے انہوں نے اُس کے قلب و دماغ میں اس احساس کو بھی پوری طرح راسخ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنے کی کوشش کی ہے کہ جب وہ اپنے اعمال کا محرک مادّی اور وقتی مصالح کی بجائے قادرِ مطلق کی رضا اور خوشنودی سمجھتا ہے تو اسے پھر اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ اُس کے اعمال کی صحیح قدر و قیمت اس مادّی دنیا میں نہیں بلکہ آخرت ہی میں متشخص ہو سکتی ہے جہاں مرنے کے بعد علیم و خبیر ذات اُس کے افعال کو عدل و انصاف کی میزان پر تول کر اُسے پورا پورا بدلہ عطا کرے گی۔

اس بنا پر عقیدۂ آخرت بھی مذہب کا اتنا ہی ضروری حصّہ ہے جتنا کہ لامحدود کا تصوّر۔

لامحدود کو سمجھنے کی تڑپ، اور اُس سے ہم آہنگ ہونے کی آرزو، اور اس آرزو کی تکمیل کے لیے اُس کے منشا اور ارادہ کو جاننے کی تمنا، پھر اس مقصد کے حصول کے لیے لامحدود کے ان فرستادوں کی طرف رجوع اور اُن کی دل و جان سے پیروی کی کوشش جن کی وساطت سے وہ حقیقت کبریٰ کا ارادہ جان سکتا ہے اور جن کے نقش پا پر چل کر وہ اپنے اندر ایسی صفات پیدا کر سکتا ہے جو اُسے لامتناہی کے قریب لا سکیں، اور اس بات کا پختہ یقین کہ اُس کی اس آرزو اور جد و جہد کے نتائج زندگی کی سرحد عبور کرنے کے بعد اُس کے سامنے آئیں گے — یہ سب احساسات و جذبات ہر الہامی مذہب کی بنیاد اور اساس ہیں۔ مذہب کی نفسیات اور اس کے فلسفے پر حکمائے قدیم و جدید نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن اگر اُن کی تحریروں کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ الفاظ کے اختلاف کے باوجود مذہب کے ان بنیادی حقائق کو سب نے تسلیم کیا ہے۔

مشہور عالمِ نفسیات پروفیسر جیمز ایچ۔ لیوبا نے (JAMSH-LEUBA) جنہیں مذہب کی نفسیاتی تحقیق کے بارے میں اولیّت کا شرف حاصل ہے، اپنی ایک فاضلانہ تصنیف میں مذہب کی مختلف تعریفات نقل کی ہیں جو مذہب کے کسی نہ کسی ضروری جزو پر حاوی ہیں لیکن جامع و مانع کوئی نہیں۔ میں ان تعریفات میں سے یہاں صرف چند تعریفیں پیش کرتا ہوں۔

ایک تعریف تو مذہب کی یہ ہے کہ "مذہب نام ہے اُس احساس کا جو کسی مقدّس، بالاتر اور ان دیکھی ذات کا وجود انسان کے قلب و دماغ میں پیدا کرتا ہے"۔ یہ تعریف اس ہلکی سی "لے" کی طرف اشارہ کرتی ہے جو ہر شخص کے اندر فطرت نے ودیعت کر رکھی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسری تعریف یہ ہے: "مذہب نام ہے ایک ازلی اور ابدی حقیقت پر ایمان لانے کا جس کی حیثیت اور ارادہ انسانی منشا اور ارادے سے بالاتر ہے اور جس کا تعلق انسان کی زندگی کے ساتھ بہت گہرا ہے"۔ اس تعریف میں زیادہ زور ذہنی عقیدے یا ایمان پر دیا گیا ہے۔

تیسری تعریف یہ ہے کہ "مذہب ایک روحانی اور نفسی حاسّہ ہے جس کی بنیاد یہ عقیدہ ہے کہ انسان اور کائنات میں باہمدگر ہم آہنگی پائی جاتی ہے"۔ اس تعریف کا خاص الخاص جز کردار یا ایمانیت نہیں بلکہ نفسِ انسانی کا نظام تاثرات ہے۔

چوتھی تعریف یہ ہے: "مذہب نام ہے ان مافوق الانسانی قوتوں کی رضاجوئی کا جو انسانی زندگی پر حکمراں ہیں"۔ اس تعریف میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ زیادہ زور عمل و کردار پر دیا گیا ہے۔

پانچویں تعریف ہے: "مذہب نام ہے اس جستجو کا جو انسان زندگی کے حقیقی مقصد کے ادراک کے لیے کرتا ہے"[1]۔

اب اگر فرداً فرداً ان تعریفات پر غور کیجیے تو ایمان، عمل، بالاتر ذات کا منشا جس کو جاننے سے زندگی بامقصد بنتی ہے، اور مذہبی تاثرات، یہ چاروں مذہب کے لازمی عناصر ہیں۔ اگر سوال کیا جائے کہ مذہب کی امتیازی خصوصیت کیا ہے تو اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ مذہب کی اساس یہ عقیدہ یا ایمان ہے کہ ہمارے اس عالمِ مجاز و محسوسات سے بالاتر، ہمارے نظامِ کائنات سے ارفع و اعلیٰ ایک ان دیکھا نظام موجود ہے، جس کا منشا سب پر حاوی ہے اور انسان فطری طور پر اس کے ساتھ مطابقت کرنے کا آرزومند رہتا ہے۔

مذہب کی ماہیت اور اس کے عناصر ترکیبی کو جاننے کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کا جاننا بھی بے حد ضروری ہے کہ جب تک یہ سارے عناصر ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہوتے اس وقت تک مذہب بالکل بیکار رہتا ہے۔ محض عقیدہ بغیر عمل صالح کے، مذہب کے مفہوم سے اتنا ہی دُور ہے جتنا کہ محض اخلاقی عمل بغیر ایقان اور ایمان کے۔ پس ان اجزا کا سمونا انتہائی ناگزیر ہے۔ وہ

---

[1] GOD OR MAN مطبوعہ لندن ۱۹۳۴ء۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عقیدہ جو انسان کے قلب و دماغ میں کسی بالاتر ہستی کا محض نقش بٹھا دے لیکن اسے اپنے ارادوں اور تمناؤں کو اُس کے بلند و بالا ارادے اور منشا کے تابع کرنے پر آمادہ نہ کرے اُس بیج کی طرح ہے جس کے برومند ہونے کا کوئی امکان نہ ہو۔

دوسرے، مذہب صرف روحانی کیف و مستی کا ہی نام نہیں بلکہ اس میں عزم، باطل قوتوں سے لڑ جانے کا گہرا جذبہ اور اس سارے نظامِ حیات کو جس میں انسان اپنا ارادہ اور اختیار رکھتا ہے، لامحدود کے دیئے ہوئے ضابطۂ حیات کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کا ولولہ بھی شامل ہے۔ مذہب اگر محض لامتناہی کو سمجھنے کی حد تک محدود ہوتا تو معاملہ دوسرا تھا۔ لیکن چونکہ انسان اُسے سمجھ کر اُس کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کا بھی شدید احساس رکھتا ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ وہ نہ صرف اپنے فکر و عمل میں لامحدود کے ضابطوں کے مطابق تبدیلی کرے بلکہ اپنے گرد و پیش، اپنے ماحول، اپنی سوسائٹی، بلکہ اپنے عہد کی پوری انسانیت کے انداز کو اس طرح تبدیل کر دے کہ وہ خالقِ کائنات کے منشا سے پوری طرح ہم آہنگ ہو جائے۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مذہب جہاں انسان کو روحانی سرور کی دولت سے مالا مال کرتا ہے وہاں اُسے زندگی کے حرکت آفریں تصور سے بھی آشنا کرتا ہے اور اُسے ایک ایسی راہ پر لگا دیتا ہے جس میں اُسے مزاحمتوں اور طوفانوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور بسا اوقات اس راہ کی دشواریاں ہی اُس کے لیے حقیقی سکون کا سامان فراہم کر دیتی ہیں۔

(باقی)

© rasailojaraid.com